روزہ اور قرآن

سید مناظر احسن گیلانی

کوڈ: 04049

منشورات

قیمت: -/3 روپے

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ فون: 3543 4909 فیکس: 4907 3543-042

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آیئے' روزے کے قرآنی مطالب کو قرآن ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

تقویٰ اور روزہ

الصیام (یعنی روزوں) کا مطالبہ سورہ البقرہ کی آیات (۱۸۳تا۱۸۵) میں کیا گیا ہے۔

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ روزہ آدمی میں ''تقویٰ'' کے جذبہ کو اُبھارتا اور بیدار کرتا ہے۔ اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے کہ رمضان ہی کے مہینے میں چونکہ قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی' اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ اس مہینے کو روزے کے ساتھ گزاریں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ''تقویٰ'' کا مطلب کیا ہے' روزے سے اس کا کیا تعلق ہے اور تقویٰ کے جس جذبہ کو روزہ اُبھارتا اور جگاتا ہے' انسانی فطرت کے اس جذبہ سے قرآن کا کیا تعلق ہے؟

ایک مثال اپنے سامنے رکھ لیجیے۔ روشنی سے وہی مستفید ہو سکتا ہے' جس کی بینائی کی قوت آلائشوں سے پاک وصاف ہو۔ اس مثال کے پیشِ نظر غور کیجیے' قرآن کیا ہے؟ آدمی کی آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل ہی کا نام قرآن ہے۔ اسی طرح تقویٰ' جس کا ترجمہ عموماً پرہیز یا ڈر وغیرہ کے الفاظ سے کر دیا جاتا ہے' فطرتِ انسانی کے اس خاص رجحان کی تعبیر ہے' جس نے آدمی کو آئین پسند بنا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک جنون سے کسی کا دماغ ماؤف ہی نہ کیا ہو' ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اعمال وافعال میں ہم مطلق العنان بنا کر نہیں پیدا کیے گئے ہیں۔ یعنی' جو جی میں آئے اسے کہہ گزریں' جسے چاہیں مار بیٹھیں' قتل کر دیں' جن کا مال چاہیں اُڑا لیں' سڑکوں پر ننگے ہو کر ناچیں' تھرکیں۔ یہ یا اسی قسم کے بہت سے کام کرنے پر ہم آمادہ ہو جائیں تو انھیں کر تو سکتے ہیں' لیکن اندر کی آواز ہمیں ٹوکتی ہے' اور حدود میں رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جو کیے جائیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نہ کیے جائیں۔ یہ تقسیم ہمارے اعمال وافعال کی' سچ پوچھیے' تو تقویٰ

ہی کے فطری جذبہ کی پیداوار ہے۔

کون کون سے کام کرنے کے ہیں' اور کون سے نہ کرنے کے' تفصیلات میں تو اختلاف ممکن ہے' لیکن ان دو حصوں میں اعمال کی تقسیم' انسان کا فطری احساس ہے۔ کسی شخص کے متعلق جونہی پتا چلتا ہے کہ اعمال و افعال کی حد بندی کے تقاضوں سے آزاد ہو گیا ہے' اس کے پاگل ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اگر تقویٰ کی واقعی حقیقت یہی ہے جو عرض کی گئی' تو پھر کتنی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کو' یعنی آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل کو' سپرد کرتے ہوئے' تقویٰ کے احساس کو چونکانے والے اور جگانے والے عمل' یعنی روزے کی پابندی کا بھی ٹھیک اسی مہینے میں کیوں مکلف بنایا گیا' جس میں قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی۔ آئین و دستور کی پابندی کا مطالبہ باہر سے جن پر پیش ہو رہا تھا' ضرورت تھی کہ ان کے اندر بھی اس احساس اور جذبے کے اجاگر کرنے کا انتظام کیا جائے جس پر آدمی کی آئینی زندگی کا دارومدار ہے۔

یہ ہے ''تقویٰ'' اور ''قرآن'' میں تعلق۔ گویا آئین کے ساتھ آئین پسندی کے جذبے کو بھی بیدار رکھنے کے بندوبست کیا گیا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آدمی میں آئین پسندی یعنی تقویٰ کا جو جذبہ فطرتاً پایا جاتا ہے' اس کے ابھارنے اور اس کو تروتازہ رکھنے میں روزہ سے کیوں مدد ملتی ہے؟

اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں بار بار جس چیز کی ضرورت آدمی کو ہوتی ہو' روزمرہ کی اسی ضرورت سے اچانک دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آئینی حدود کے اندر اپنے آپ کو روکے رکھنے کی پوری قوت اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ سال کے گیارہ مہینوں میں جو کھا رہا تھا' پی رہا تھا' جنسی تقاضوں کی تکمیل پر جس کو کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی' وہی بارہویں مہینے میں اس امتحان میں کامیاب ہو کر نکلتا ہے کہ ساری چیزیں' جن کا گیارہ مہینوں میں عادی تھا' ان کو چھوڑ بیٹھا۔ آئینی جذبے کی مشق کی اس سے زیادہ بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی۔

اب پڑھیے روزہ والی آیتوں کو۔ انصاف سے بتایا جائے کہ خود قرآن نے روزہ کے قانون کو نافذ کرتے ہوئے جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا ہے' دل آویزی اور دل نشینی کی جتنی غیر معمولی خنکی اس

میں پائی جاتی ہے' کیا عقل کے ناخن تراشوں کی تاویلوں میں اس کے بعد کچھ بھی جان رہ جاتی ہے؟ اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ روزہ اور اس کے اسرار و حکم اور وجوہ و مصالح کو سمجھنے کے لیے بجائے قرآن کے غیر قرآنی راہوں سے مدد لینے کی قطعاً حاجت نہیں۔

دوسرے مذاہب سے تعلق

ہوں سے مدد لینے کی قطعاً حاجت نہیں۔

روزے کے مطالبے کو مسلمانوں پر عائد کرتے ہوئے گذشتہ ادیان و مذاہب کو ماننے والی اُمتوں کے ساتھ اپنے تاریخی رشتہ کا اعادہ کَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

اس سے مسلمانوں میں یہ نفسیاتی اثر پیدا ہوتا ہے کہ اس حکمِ الٰہی کا بار اٹھانے میں وہ تنہا نہیں ہیں' بلکہ جو انسانی نسلیں ان سے پہلے گزری ہیں وہ بھی اس میں ان کی شریک ہیں۔ اسی سے خود بخود یہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ روزے کا مطالبہ کوئی ایسا مطالبہ نہیں ہے کہ جسے بار سمجھا جائے۔ آخر جس کام کو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے انسانیت برداشت کرتی چلی آ رہی ہے' اس کو بار اور بوجھ قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ گویا برداشت کے لحاظ سے یہ تجربہ کیا ہوا' جانچا اور پرکھا ہوا عمل ہے' سمجھا جائے تو یہ اشارہ بھی قرآن کے الفاظ سے ہمیں مل سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حیوانی ضرورتوں کے لیے حرارت' روشنی' ہوا' پانی وغیرہ جیسی قدرتی امدادوں کا آدمی ہر زمانے میں ہر جگہ محتاج رہا ہے' یہی نوعیت قدرت کے ان قوانین کی بھی ہے جن کی پابندی کے بغیر انسان' انسان نہیں رہ سکتا۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''اگلوں پر بھی روزہ فرض کیا گیا تھا'' تو اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ بھی قدرت کے ان ہی قوانین میں شریک ہے جن سے نہ اگلے بے نیاز ہو کر رہ سکتے تھے اور نہ پچھلے اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔

یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں آج کل مذاہب و ادیان کی تنقید و تحقیق کے سلسلے میں تقابلی مطالعے کو سب سے زیادہ عالمانہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ پہلے تو مذہبی پیشہ وروں' یعنی پادریوں نے اس کام کو شروع کیا تھا۔ بعد کو ان ہی پادریوں کی اولاد دوسرے علمی القاب اور

خطاب کے ساتھ اسی کام کو ریسرچ اور تحقیق کے نام سے انجام دینے لگی۔ باور یہی کرایا جاتا ہے کہ تنقید و تحقیق کی ان راہوں میں کسی خاص مذہب یا دین کی پاسداری خیانت اور علمی بددیانتی سمجھی جائے گی۔ لیکن سارے پاپڑ دراصل کسی خاص مذہب کی تائید وحمایت ہی کے لیے بیلے جاتے ہیں۔

اس تقابلی مطالعہ میں مختلف ادیان و مذاہب اور ان کے پیش کرنے والے بزرگوں کی تحقیر وتنقیص سے دامن ضرور آلودہ ہوتا ہے۔ تحقیر وتنقیص کے ان قصوں سے دلوں کو جو دکھ پہنچ جاتا ہے' یا پہنچایا جاتا ہے' دل آزاری کی جو آندھیاں چل پڑتی ہیں' ان کا رکنا یا روکنا ناممکن ہوتا ہے۔

اس بات میں غیروں سے نہ مجھے شکایت ہے' اور نہ شکایت کا حق حاصل ہے۔ مگر مسلمانوں میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ دعوت وتبلیغ کے قرآنی منہج خاص سے لاپروا ہوکر' کچھ لوگ کچھ دنوں سے ان ہی باتوں کی حوصلہ افزائیوں میں مشغول ہیں جن سے تقابلی مطالعے اور اس طریقے کے سارے مفاسد اور زہریلے فتنوں کی نشوونما میں مدد مل رہی ہے۔ دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں گھٹتا ہوں' کڑھتا ہوں۔ قرآن سکھاتا ہے کہ بنی آدم کی جن جن نسلوں کو' مسلمانوں سے پہلے' اپنے اپنے وقت میں انسانی زندگی کے قدرتی دستور العمل کا مخاطب ومکلّف خالق کائنات نے بنایا تھا' ان سب سے مسلمانوں کا تاریخی رشتہ تکذیب وتغلیط اور تحقیر وتوہین کا نہیں' قطعاً نہیں' بلکہ تصدیق و توثیق کا ہے۔ ایک ہی دیوانِ عشق کے ہم سبق ہم سب کے سب ہیں' ایک ہی لاہوتی کالج سب کی تعلیم گاہ ہے' حقیقی معلّم اور واقعی استاد بھی سب کا ایک ہی ہے' اور بجز معمولی ردوبدل کے' اصولاً تعلیمی نصاب بھی اگلوں اور پچھلوں کا اوّل سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔

قرآن نے اپنے ماننے والوں کی ذہنی تربیت ہی کچھ ایسے ڈھنگ سے کی ہے کہ ہمارے پیشوا تمہارے پیشوا' ہمارے دینی بزرگ تمہارے دینی بزرگ--- یہ ہم تم کا سوال ہی' مذہب اور دین کے دائرے میں' ان کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا ہے۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کا جب ذکر کرتے ہیں تو سننے والا یہ تمیز نہیں کرسکتا کہ خود اپنے گھر کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں یا ان لوگوں کا جن کو یہودی اپنا پیغمبر یا عیسائی اپنے دین کی سب سے بڑی ہستی تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل گھر اور باہر کے اس فرق کو مسلمانوں کا دینی احساس

پہچانتا ہی نہیں ہے۔

مسلمانوں پر روزے کو عائد کرتے ہوئے' بجائے یہ فرمانے کے کہ مسلمانوں کے دین کا یہ کوئی امتیازی سرمایہ ہے' قرآن نے صاف لفظوں میں یہ اطلاع دی ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' بلکہ پہلے بھی لوگ اسی کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں۔

قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ بچھڑے ہوؤں کو ملانا' اور اپنے بزرگوں کی راہ سے جو ہٹ گئے ہیں اسی راہ پر ان کو واپس لانا' یہ بھی اس کا اساسی نصب العین ہے' تو روزہ کے بارے میں اس بیان کی تعبیر اور کیا کی جائے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دین کی دعوت میں لوگ دل آزاری کی راہوں کو چھوڑ کر قرآنی راستے پر اگر چلتے' تو جن قوموں کی اسلام سے محرومی کی مدت' دراز سے دراز تر ہوتی چلی جارہی ہے' بہت مختصر ہو جاتی۔

ضرورت ہے کہ تصدیق وتوثیق کے رشتے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ گذشتہ ادیان ومذاہب کے جن پہلوؤں کی تصحیح یا تکمیل کا کام قرآن نے انجام دیا ہے' اس کا صحیح مطلب کیا ہے۔ اسی موقع پر دیکھئے۔ رمضان ہی کے مہینے کو روزے کے لیے متعین کرتے ہوئے' نزول قرآن کے ذکر میں' یہ فرما کر کہ نسل انسانی کی ہدایت کا سرچشمہ یہ کتاب ہے' آگے اسی کی خصوصیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرہ ۲:۱۸۵) ہدایت کی کھلی کھلی باتوں پر (قرآن مشتمل ہے)' اور الفرقان بھی ہے۔ مطلب یہی ہے کہ مذہب وادیان کے بیانات' یعنی واضح اور کھلے کھلے حقائق جنھیں عام طور پر لوگ جانتے ہیں' ان کے سوا قرآن الفرقان بھی ہے۔ یعنی بیرونی آمیزشوں اور خارجی آلائشوں کو تمام مذاہب وادیان سے جدا کرنا' سب کو پاک وصاف کرنا' یہ بھی قرآن ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس لیے رمضان یا نزول قرآن کا مہینہ ان لوگوں کا بھی دینی مہینہ ہے جن کے پاس پہلے سے ہدایت کے بینات نہ تھے' اور جن کے پاس کسی نہ کسی شکل مین ہدایت کے یہ بینات باقی رہ گئے تھے' ان کے لیے بھی رمضان اس لیے دینی مہینہ بن گیا کہ قرآن کے فرقانی پہلو سے استفادے کا موقع ان کو بھی ملا۔ یوں رمضان ساری انسانی نسلوں' خاندانوں اور قبیلوں کا دینی مہینہ بن جاتا ہے۔

بہرحال مجھے کہنا یہی ہے کہ قرآن جیسی خودمکتفی کتاب کی اشاعت وتبلیغ کے لیے' یا اس کی

تعلیمات کی توجیہ وتاویل کے لیے' غیر قرآنی ذرائع کی دست نگری کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن آگے تو کیا بڑھتا' خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں (لا فعلہ اللہ) اس کا دائرہ گھٹ نہ جائے۔ اگرچہ یہ خطرہ بھی صرف دلوں کے ایک وسواسی خطرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

روزہ میں یسر

روزے کے متعلق یہ طریقۂ تعبیر اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو اَیَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ' یعنی چند گنے چنے دن' روزہ فرض ہوا' اور بعد کو پھر رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے جدا سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ دونوں دو مستقل مطالبے نہیں ہیں۔ رمضان ہی کے مہینے کو روزے کے حکم کی تعمیل کا مہینہ مقرر کرنا مقصود تھا' لیکن اسی مقصد کو پہلے عام الفاظ میں ادا کیا گیا--- یعنی بڑی مدت روزے کے لیے نہیں بلکہ ''چند گنے چنے دن'' کی حد تک اس عمل میں مسلمانوں کو مشغول ہونا پڑے گا--- پھر ان ہی گنے چنے دنوں کی تفصیل یہ کی گئی کہ وہ رمضان کا مہینہ ہے۔ یہ یسر کی وضاحت ہے۔

روزہ کی یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ سب سے زیادہ آدمی جن چیزوں کا عادی ہوتا ہے' روزے کی وجہ سے اپنی اسی دوامی عادت سے دست برداری کی مشق پیدا ہوتی ہے۔ ذاقعہ یہ ہے کہ دین ہو یا دنیا' زندگی کے تمام شعبوں میں اس مشق سے یہ مدد ملتی ہے کہ عادت کے خلاف کسی قسم کی مشکلات سے دوچار ہونے کا موقع سامنے آجائے تو روزے کی مشق ان مشکلات کو قدرتاً روزہ رکھنے والوں کے لیے آسان بنا دیتی ہے۔ اسی لیے جن رعایتوں اور جن شروط کے ساتھ روزہ کا مطالبہ واجب کیا گیا ہے' ان ہی کو دیکھ کر تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ مشقت اور دشواری میں مبتلا کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا ہے' بلکہ اس کے مقابلے میں' روزے کی مشق سے زندگی کی عام مشکلات میں مدد ملتی ہے۔ خصوصاً قمری مہینے کی وجہ سے' ہر موسم اور سال کے ہر حال میں روزہ رکھنے کی عادت سہولت کے دائرے میں جس وسعت کو پیدا کرتی ہے' اور مشقت کی برداشت کی قوت کو بڑھاتی ہے' اس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ روزے سے آسانی پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔

شکر اور وفاقی تعلق

انسانیت' ہدایت کے جس نظام کی پابندی کر کے اپنے صحیح انجام تک پہنچ سکتی ہے' یقیناً اس کا علم ساری انسانی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ روزہ اس غیر معمولی' انمول نعمت سے سرفراز فرمانے والے کی بڑائی کے اقرار کی بہترین عملی شکل ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جن چیزوں کا رسیا اور عادی ہے' ہر ایک کو ٹھکرا کر اس بڑے کے حکم کی تعمیل کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ''تاکہ بڑائی کرو اللہ کی' اس نعمت کے مقابلہ میں کہ تمھاری رہنمائی اس نے کی''۔

سچ تو یہ ہے کہ زندگی بھر جو ہمیں کھلاتا پلاتا رہتا ہے اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے' آدمی کا جی چاہتا ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ کوئی شک نہیں کہ شکر اور گن گانے کی صورتیں یہ بھی ہیں کہ زبان سے شکر کے الفاظ ادا ہوتے ہوں' یا دل میں تشکر و امتنان کے جذبات پیدا ہوں۔ لیکن کھلانے پلانے والے کے شکر کی یہ شکل---جتنی دیر کے لیے کھانا چھوڑ دینے کا حکم کھلانے والے پلانے والے نے دیا' اتنی دیر کے لیے ہم اس کو چھوڑ بیٹھیں---حق تو یہ ہے کہ زبان اور دل والے شکریوں سے شکر کا یہ عملی قالب' خود شکر کرنے والوں ہی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہے۔ اس کی طرف آخر میں ''تاکہ تم شکر ادا کرو'' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا تھا۔

''جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے میرے متعلق' تو میں قریب ہوں' جواب دیتا ہوں پکارنے والے کی پکار کا''۔ اس آیت سے پہلے بھی روزے کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی۔ بیچ میں اس آیت کا ہونا یقیناً بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔

بظاہر یہی خیال گزرتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم کے مطابق جب بندہ پسندیدہ عادتوں سے دستبردار ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کی خوشی اور اسی کی مرضی کے مطابق اپنی خوشی اور اپنی مرضی کو بنا دیتا ہے تو روزہ کے زمانے میں روزہ دار کا خالق کائنات کے ساتھ اس وفاقی تعلق کو قرآن بتانا چاہتا ہے' معمولی حال نہ سمجھنا۔ منطقی طور پر یوں ترتیب قائم کی جائے کہ ساری کائنات حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے۔ انسان جب اسی عالمگیر مرضی کے مطابق اپنے آپ کو کر لیتا ہے تو اس خاص حال میں عالم کا ہر قانون' انسان کی مرضی کی مطابقت کے لیے تیار ہو جاتا ہے' یعنی اس کی ہر دعا کو حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے اس کے سوا دوسری توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے؟

(اخذ و تلخیص: خرم مراد) ☆ (ترجمان القرآن - فروری ۹۵ء)